برصغیر پاک و ہند میں
برطانوی دور کے تعلیمی ارتقاء پر ایک نظر

از جناب محمد عبدالقادر عمادی حیدر آباد دکن

ثقافت کا ہر مظہر تعلیم کا رہین منت ہوتا ہے۔ لیکن تعلیم چونکہ ذہنی تربیت اور نشوونما سے عبارت ہے جو ایک غیر مرئی حقیقت ہے۔ اس لیے وہ نظر نہیں آتی البتہ اس سے پیدا شدہ ثقافت اس کے معیار کا پتہ دیتی ہے۔ یہ بات خاص طور سے اس زمانہ پر صادق آتی ہے جس زمانہ کی تعلیمی مشغولیات اور اس کے کارناموں کا سرمایہ تحریری اور کتابی شکلوں میں موجود نہ ہو بلکہ وہ گردش دوراں کے ساتھ ساتھ تلف ہو چکا ہو۔ لیکن بہرحال جس ثقافت کے بارے میں جو بھی مواد ہمیں ملتا ہے وہ اس زمانہ کی تعلیمی سرگرمیوں اور اس کے معیار کا پتہ دیتا ہے۔ جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ یہاں کی تہذیب دنیا کی قدیم ترین تہذیبوں میں شمار کی جاتی ہے۔ اور اس کا ماضی بہت درخشاں رہا ہے۔ ریاضی اور فلسفہ میں آج سے ہزاروں برس پہلے بھی ہندوستان کا معیار انتہائی بلند تھا۔ چنانچہ مشہور ہے کہ صفر کی ایجاد ہندوستان میں ہوئی اور ہر تعلیم یافتہ آدمی یہ جانتا ہے کہ صفر کی اہمیت کس قدر بنیادی ہے۔ اس طرح فلسفہ اور مابعد الطبعیات میں ہندوستانی مفکرین نے فکر کی انتہائی بلندیوں کو چھو لیا۔ گیتا اور ویدوں کے فلسفے معمولی ذہن و فکر کی ایجاد نہیں اسی طرح مہاتما بدھ کے افکار نے عقل و دانش کے نئے دبستان کھول دیئے۔ آج بھی بدھ مذہب کے علماء سے تھوڑی دیر گفتگو کی جائے تو قدیم فکر کی محیر العقول جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ برہمنوں کے طبقہ نے علمی مشغولیت کو ہر زمانہ میں اپنا شعار بنائے رکھا گو کہ بڑی حد تک تعلیم اور درس و تدریس کا راست تعلق قدیم زمانہ میں مذہبی اداروں سے وابستہ رہا لیکن ان کی فکر اور مشاہدہ کے دائرے کبھی بھی محض مذہب تک محدود نہیں رہے بلکہ ہر زمانہ میں اس میں فلسفہ ' طب فلکیات ' علم نجوم اور معاشرتی مباحث بھی شریک رہے۔

ٹکسلا اور نالندہ کے کھنڈروں ' مہنجوداڑو کی تہذیب ' پاٹلی پترا کی تاریخ ' کوٹلیا کی تصنیف ' مہا بھارت کی داستانیں ' پران اور رامائن ' تلسی داس کے ڈرامے وغیرہ قدیم ہندوستان کی عظمت کی نشاندہی کرتے ہیں ۔ جیسے جیسے زمانہ آگے بڑھتا گیا تاریخی تبدیلیاں ہوتی رہیں ۔ حکومتیں بنتی اور بگڑتی گئیں ۔ علم کے مراکز ہندوستان کے نقشہ میں ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتے رہے۔ لیکن بحیثیت مجموعی علمی سرمایہ میں مسلسل اضافہ ہوتا رہا۔ اس میں کوئی شک

نہیں کہ سیاسی انقلابات کی وجہ سے کبھی کبھی رفتار سست بھی ہوئی لیکن سلسلہ کبھی منقطع نہیں ہوا۔

چنانچہ ابو ریحان البیرونی نے سنسکرت سیکھ کر ہندوستانی علوم سے واقفیت حاصل کی اور زمانہ کی گردش میں کھو جانے والے علمی سرمایہ کو اپنے اقتباسات میں محفوظ کر دیا۔ اس کی مشہور کتاب "تحقیق ہند" ہندوستان کی ثقافت اور اس کی علمی عظمت کا زندہ ثبوت ہے۔

جب مسلمانوں کا دور شروع ہوا تو ہندوستان کے علمی خزانہ میں ایک نیا رنگ پیدا ہوا۔ مسلمان ایک نئے ' عقیدہ نئے مذہب ' نئی فکر اور نئے ولولوں کے ساتھ ہندوستان میں داخل ہوئے اور ان کی سیاسی کامیابیوں نے ان کی ہمہ جہتی مہمات کو فروغ بخشا۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ مسلمانوں کی آمد کے بعد ہندوستان کے قدیم علوم ختم ہوگئے بلکہ یہ کہ ان کے ساتھ ساتھ علمی سرگرمیوں کی نئی راہیں کھل گئیں۔ مسلمان اپنے ساتھ یونانی اور اسلامی فلسفہ اور ایران ' عرب اور وسط ایشیا کی تہذیب لائے۔ وہ اپنے ساتھ عربی اور فارسی کی ترقی یافتہ زبانوں کا سرمایہ بھی لائے۔ اور ان سب کی مدد سے انہوں نے ہندوستان میں تعلیم کے نئے اور بے شمار ادارے قائم کئے۔ مسلمانوں کی قرون وسطی کی تہذیب کے چار زندہ ثبوت ہیں : (۱) ان کے تعمیر کردہ قلعے اور محلات۔ (۲) مسجدیں اور خانقاہیں (۳) مقبرے (۴) تعلیمی ادارے۔ ان چاروں عوامل پر اگر غور کیا جائے تو زندگی کے تعلق سے ان کے تین واضح رجحانات کا پتہ چلتا ہے۔ قلعوں کی تعمیر ان کی زندگی اور حوصلہ مندی کی دلیل ہے' محلات ان کی شان و شوکت کا ثبوت ہیں اور تیسری طرف شاندار مقبروں کی تعمیر اس نقطہ نظر کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ انسان اپنی حیات کو جاودانی بخشنے کا خواہاں ہے اور موت کو زندگی کی شکست نہیں سمجھتا۔ چنانچہ ملک کے چپہ چپہ میں اس کی نشانیاں موجود ہیں اور اس پوری ثقافت کی تعمیر میں تعلیم کا حصہ رہا ہے۔ ہر مسجد یا خانقاہ محض عبادت اور ریاضت کا مرکز نہیں ہوا کرتی تھی بلکہ وہ ساتھ ساتھ درس گاہ بھی ہوتی تھی۔ چنانچہ ہر بڑی مسجد میں متعدد حجرے نظر آتے ہیں وہ دراصل تعلیم کے لیے وقف تھے اور یہاں صرف مذہبی تعلیم نہیں ہوتی تھی بلکہ ہندو پاٹھ شالاؤں کی طرح مسجدوں میں بھی تمام علوم موجودہ کی درس و تدریس کا انتظام ہوتا تھا۔ چنانچہ ہر مسلمان بادشاہ کے زمانہ میں ان عبادت گاہوں میں لاتعداد مدارس قائم تھے۔ التمش کے زمانہ میں' جو خاندان غلاماں کا دوسرا اہم بادشاہ تھا' دہلی میں ایک ہزار مدرسے موجود تھے۔ اس زمانہ کی تعلیمی ترقی کا اس سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اکثر حکمراں جن کو زمانہ تھوڑی سی فرصت اور سکون عطا کرتا تھا' خود بھی علم سے بڑا شغف رکھتے تھے۔ وہ صرف جری اور بہادر سپاہی ہی نہیں ہوتے تھے بلکہ بڑے عالم بھی تھے۔ مثلاً" محمد

بن تغلق' سلطان ناصر الدین محمود خود بڑے عالم تھے۔ جب مغلوں کا زمانہ آیا تو تعلیمی مصروفیات میں اضافہ ہی ہوتا گیا۔ بابر خود بڑا صاحب قلم تھا۔ وہ شاعر بھی تھا۔ ہمایوں علمی ذوق رکھتا تھا۔ اکبر کو اگرچہ کہ پڑھنے لکھنے کا وقت نہیں ملا لیکن اس کے علم میں کسی کو شبہ نہیں ہو سکتا۔ اس کا حافظہ غیر معمولی تھا اور روزانہ علماء کی صحبت جس میں ہر مذہب اور مسلک کے لوگ شریک ہوتے تھے' انتہائی ادق مسائل پر بحثیں ہوتی تھیں اور خود اکبر ان مباحثوں کا روح رواں تھا۔ اس کے دربار میں ابو الفضل اور فیضی جیسے علماء موجود تھے۔ جونپور کی مشرقی حکومت کے زمانہ میں تعلیم نے اتنی ترقی کی تھی کہ جونپور کا پورے ہندوستان میں شہرہ تھا اور سلطنت مغلیہ کے قیام کے بعد بھی شاہ جہاں نے جونپور کو شیراز ہند کے نام سے یاد کیا۔ جہانگیر بھی صاحب قلم تھا اورنگ زیب بھی بہت بڑا عالم تھا۔ اورنگ زیب کے زمانہ میں تیار کردہ فتاوائے عالمگیری" تمام دنیا میں مشہور ہے۔ یہ تو محض حکمرانوں کا سرسری تذکرہ ہے لیکن ان کے ادوار میں جو بے شمار علماء پیدا ہوئے ہیں ان کا تذکرہ بہت زیادہ طوالت کا باعث ہوگا۔ محض اتنا اشارہ کافی ہے کہ لاہور' دہلی' آگرہ' اجمیر' قنوج' جونپور' لکھنؤ' پٹنہ وغیرہ قرون وسطی میں تعلیم کے بہت بڑے مراکز تھے۔

اسی طرح جنوبی ہندوستان میں بھی تعلیم کی ہر زمانہ میں سرپرستی کی گئی۔ سلطنت بہمنیہ کے تحت ایران' عرب اور دوسرے ممالک سے بڑے بڑے علماء ہندوستان آئے۔ چنانچہ بعض بہمنی سلطانوں نے خاص طور سے کئی جہاز بصرہ اس لئے بھیجے کہ علماء کی بڑی تعداد کو ہندوستان مدعو کیا جائے۔ خواجہ محمود گاواں کا مدرسہ بیدر میں سلطنت بہمنی کی تعلیمی سرگرمیوں کا لافانی ثبوت ہے۔ جب بہمنی سلطنت کو زوال ہوا اور یہ پانچ چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹ گئی تو اس کے ساتھ ساتھ تعلیمی مراکز بھی منتشر ہوگئے لیکن بیجاپور اور گولکنڈہ عادل شاہی اور قطب شاہوں کے صدر مقام تعلیم کے زبردست مرکز رہے۔ احمد نگر کو اس کا موقعہ کم ملا کیونکہ اسے ہمیشہ شمال کے حملوں کا مقابلہ کرنا پڑا۔ اسی طرح برید شاہی اور عماد شاہی سلطنتیں اتنی چھوٹی تھیں کہ وہاں تعلیم کی طرف زیادہ توجہ نہیں کی جاسکی لیکن عادل شاہی اور قطب شاہی سلطنتوں میں بڑے بڑے علماء' شعراء اور ادیب پیدا ہوئے۔ علمی محفلیں صرف شاہی دربار میں منعقد نہیں ہوتی تھیں بلکہ ہر امیر اپنی شان و شوکت کی بلندی کو ثابت کرنے کے لئے علماء کی سرپرستی ضروری سمجھتا تھا۔ اور چونکہ یہ تمام سلطنتیں امراء کے اتحاد' ان کے علم اور جفاکشی پر قائم ہوتی تھیں اس لئے علم ہر امیر کی محفل کی زینت ہوتا تھا۔ گویا شمال اور جنوب میں علمی مصروفیات مسلمانوں کے تقریباً" یک ہزار سالہ دور میں پورے آب و تاب کے ساتھ جاری رہیں۔

جنوبی ہندوستان میں اور نیچے جائیں تو وجے نگر کی سلطنت میں اس کی تہذیب اور اس کی وسعت اس کے حکمرانوں کے تدبر اور اس کے علماء کی دانشورانہ رہنمائی کا ثبوت دیتی ہیں۔ جنوبی ہندوستان کی چالوکیہ ' کاکتیہ ' ستیاوانہ اور دوسری تمام ریاستوں میں تعلیم کی ترقی کی طرف حکمرانوں نے ہمیشہ توجہ دی۔ گویا ہندوستان کی تاریخ کا ہر دور علمی بصیرت اور علم دوستی کا ثبوت دیتا ہے۔ انگریزوں کی آمد سے پانچ تا چھ ہزار برس پہلے سے محدود یا کل ہند پیمانے پر تعلیمی مشغولیات جاری رہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ ہر زمانہ کا نظام تعلیم ایک خاص انداز فکر کی نشاندہی کرتا ہے۔ جب کسی ملک کو کسی ایسے انداز فکر یا طرز زندگی سے سابقہ پڑتا ہے جو اس سے زیادہ زور آور اور اختراعی ہو تو ایسی صورت میں اول الذکر ملک کا نظام تعلیم ناقص اور فرسودہ نظر آنے لگتا ہے۔ لیکن حقیقت دراصل یہ ہے کہ جب طرز زندگی میں انقلاب پیدا ہوتا ہے تو اس کے ساتھ تعلیمی نظام میں بھی تبدیلی ناگزیر ہو جاتی ہے۔ چنانچہ ہندو نظام تعلیم مسلمانوں کی آمد کے بعد اتنا موثر اور کامیابی کی ضمانت نہیں رہا۔ بابر کی توپوں نے ابراہیم لودھی کی فوج کے ہزاروں ہاتھیوں کے رخ موڑ دیئے کیونکہ زندگی کی طاقت کا ایک نیا مظاہرہ نبرد آزما تھا۔ اسی طرح جب انگریز آئے تو ان کی مغربی فکر ' تدبر' ڈپلومیسی ' ڈسپلن ' انداز جنگ اور سیاسی ریشہ دوانیوں نے ہندوستانی فکر و نظر کو بہت پیچھے ڈال دیا۔ سوچنے اور جینے کا پرانا انداز اور نظام نئی فکر کے سامنے کمزور نظر آنے لگا۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ماضی کا نظام تعلیم ناقص یا فرسودہ تھا۔ بلکہ یہ کہ اس کے تقاضے جداگانہ تھے۔ حالات مختلف تھے لیکن ظاہر ہے کہ زندگی کے سماجی تعلقات اور معاشرتی مطابقت میں ہمہ وقت تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ اور کوئی تعلیمی نظام اسی وقت تک موثر اور کارگر رہ سکتا ہے جب تک کہ وہ ان تقاضوں کا جواب پیش کر سکے۔ یہ بات صرف ہندوستان کی حد تک ہی صحیح نہیں بلکہ ساری دنیا کی تاریخ اس کی گواہ ہے۔ جو بھی سلطنت زوال نصیب ہوئی اس کا سب سے بڑا سبب یہی رہا کہ اس کا نظام تعلیم حملہ آور کے مقابلہ میں کمزور اور پسماندہ ہوگیا چنانچہ بارھویں صدی کے بعد مسلمان فاتح جب یورپ کی طرف بڑھنے لگے اور پندرھویں صدی میں جب انہوں نے قسطنطنیہ پر قبضہ کرلیا تو یورپ کی اقوام نے پہلی بار محسوس کیا کہ ان کا قدیمی مسیحی نظام تعلیم جمود کا شکار ہو چکا ہے۔ اور یہ جمود ان کے قومی زوال کا سبب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے ردعمل کے طور پر پرانے مسلک سے بغاوت شروع ہوئی جو نشاۃ ثانیہ اور فکر جدید کی بنیاد ثابت ہوئی۔ یہ اور اسی قسم کے تمام انقلابات ایک عظیم سماجیاتی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ یعنی اجتماعی زندگی فکر و عمل کے حرکی نظام پر قائم ہوتی ہے۔ اور جب کسی معاشرہ کے فکری سرمایہ میں تعطل یا جمود پیدا ہو جاتا ہے تو اس کی بقاء

خطرہ میں پڑ جاتی ہے۔ دوسرے یہ کہ مختلف معاشروں میں جدا جدا انداز میں فکری کاوشیں جاری رہتی ہیں جب ان میں تصادم یا ٹکراؤ پیدا ہوتا ہے تو جس معاشرہ کے فکری اثاثہ کا سرمایہ زیادہ قیمتی اور جاندار ہوتا ہے اسے بالاخر دوسرے پر فتح اور تسلط حاصل ہو جاتا ہے گویا اجتماعی زندگی کی نصرت اور کامیابی کا انحصار اس کی فکری دولت یعنی تعلیمی نظام اور اس کی قدروقیمت پر ہوتا ہے۔ بالفاظ دیگر سماج اور تعلیم کے مابین ایک مثبت اور فعال رشتہ پایا جاتا ہے۔

قرون وسطیٰ میں ہندوستان میں جو نظام تعلیم رائج تھا وہ اس وقت کی ثقافت ' معاشرتی زندگی ' معاشی ضروریات اور سیاسی مہمات کے لیے بڑی حد تک موزوں اور مناسب تھا۔ چنانچہ ہندوؤں میں تعلیم کے لیے لاتعداد پاٹھ شالے قائم تھے جہاں مذہبی اور دوسرے علوم کی تعلیم دی جاتی تھی۔ مسلمانوں کے تعلیمی اداروں میں مکتب اور مدرسے شامل تھے۔ مکتب وہ تعلیمی ادارے تھے جن میں ابتدائی تعلیم کا انتظام ہوتا تھا جو وسطانی درجہ تک محدود تھے۔ اس کے بر خلاف مدرسے اعلیٰ تعلیم کی درس گاہیں ہوتی تھیں جن کا نصاب کافی وسیع اور جامع ہوتا تھا۔ اس قسم کے مکتب اور مدارس ہندوستان کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے تھے۔ عوام ان میں تعلیم حاصل کرتے تھے۔ لیکن جہاں تک امراء کا تعلق ہے ان کی تعلیم کا انتظام بڑی حد تک ان کے گھروں اور محلوں میں کیا جاتا تھا۔ جہاں فاضل اساتذہ مختلف علوم کی تعلیم دیتے تھے۔ عہد وسطیٰ کا یہ تعلیمی نظام اس زمانہ کے معاشرہ کے لیے خود مکتفی تھا اور سماجی اور سیاسی ضروریات کی اس سے تکمیل ہو جاتی تھی۔

اٹھارویں صدی کی ابتدا یعنی ۱۷۰۷ میں اورنگ زیب کے انتقال کے بعد ہندوستان کی تاریخ میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ یوں تو سولھویں صدی ہی سے یورپ کے مختلف قوموں کے مہم پسند تاجر اور ملاح مشرقی دنیا کا چکر لگانے لگے تھے لیکن ابھی ان کی جڑیں ہندوستان میں مضبوط نہیں ہوئی تھیں ۔ یورپ سے خاص طور پر ڈچ' ڈنمارک کے لوگ' **پرتگیزی**' فرانسیسی اور انگریز زیادہ تعداد میں ہندوستان کے ساحل پر لنگر ان ہوئے۔ سمندری دوڑ میں یوں تو اسپینی بھی بہت آگے تھے لیکن **پرتگیزیوں** اور ڈچ کے بالمقابل انہوں نے آپسی معاہدہ کے تحت اپنی توجہ خصوصاً" جنوب کی طرف مرکوز رکھی تھی۔ اس لئے انہوں نے ہندوستان کی طرف خاص تعداد میں رخ نہیں کیا۔ ہندوستان کے ساحل پر گوا' کالی کٹ ' مولی پٹم اور کلکتہ کی بندر گاہیں ان کی آما جگاہ تھیں ۔ ان مقامات پر یورپی اقوام کے تاجروں نے اپنی تجارتی منڈیاں قائم کیں اور تحفے تحائف پیش کر کے مقامی راجاؤں اور حکمرانوں سے انہوں نے اپنی تجارت کے لئے سیاسی مراعات حاصل کر لیں۔ چنانچہ ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کا قیام سب سے پہلے ۱۶۰۱ء

میں عمل میں آچکا تھا۔ جیسے جیسے زمانہ گذرتا گیا ان اقوام نے اپنی تجارت کو استحکام اور فروغ دینے کے لیے مقامی سیاست میں حصہ لینا شروع کیا۔ ان ریشہ دوانیوں سے انہیں اکثر فائدہ ہو جس کے صلہ میں ان کا حلقہ اثر بڑھتا گیا اور زیادہ سے زیادہ تجارتی منڈیاں قائم ہوتی گئیں۔ نہ اندرون ملک ان کا دائرہ اثر بڑھتا گیا۔ مغربی اقوام کی آمد کے ہمیشہ دو مقاصد رہے۔ پہلا مقصد تجارتی تعلقات کا قیام تھا اور دوسرا مقصد عیسائیت کی تبلیغ تھا۔ ان دونوں مقاصد کی عمل آوری میں ہر یورپی قوم نے پوری دلچسپی اور خلوص سے کوشش کی۔ یوں تو آپس میں ان اقوام کے مابین رسہ کشی ہوتی رہی اور ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی سازشوں میں وہ ہمیشہ مصروف رہے تاہم جہاں تک مسیحیت کے فروغ کا تعلق تھا اس میں سب یکساں تھے۔ اس کے لیے سب سے اہم چیز تعلیم کا فروغ تھا۔ چنانچہ عیسائی مشنریوں نے دوسری تبلیغی مساعی کے ساتھ ساتھ تعلیم پر خاص توجہ دی چنانچہ سترھویں صدی ہی میں ان تمام تجارتی منڈیوں میں ان کی درس گاہیں قائم ہو چکی تھیں۔ شروع ہی سے وہ مقامی زبان سیکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ چنانچہ سترھویں صدی میں بنگالی، تامل اور دیگر کئی ہندوستانی زبانوں میں انجیل کا ترجمہ ہو چکا تھا۔ اٹھارویں صدی میں اس کا ترجمہ اردو بھی کیا گیا۔ ان کوششوں کا مقصد یہ تھا کہ مسیحی اور مغربی افکار کو ہندوستانیوں میں عام کیا جائے۔

اورنگ زیب کے انتقال کے بعد سلطنت مغلیہ کا شیرازہ بکھر جانے لگا۔ مرکزی حکومت کمزور ہوگئی۔ صوبہ جات کے گورنروں نیز بڑے بڑے جاگیرداروں اور راجاؤں نے خود مختاری کا اعلان کر دیا یا کم از کم اندرونی طور سے ہر اعتبار سے خود مختار ہو گئے۔ سیاسی طوائف الملوکی کا یہ دور مغربی اقوام کی عقابی نظروں سے پوشیدہ نہ رہ سکا۔ انہوں نے ہندوستان کے جاگیردارانہ نظام کی کمزوریوں کو تاڑ لیا۔ کیونکہ خود یورپ میں اس سے پہلے مرکزی حکومت کے کمزور ہونے کے بعد بڑی بڑی سلطنتیں اسی قسم کے انتشار کا شکار ہو چکی تھیں۔ چنانچہ اس موقعہ سے انہوں نے پورا فائدہ اٹھایا۔ اور ٹیپو سلطان، نظام حیدر آباد مرہٹوں نیز بنگال کے حکمراں حلقوں میں انہوں نے اپنا اثر بڑھانا شروع کیا۔ اٹھارویں صدی سے مغربی قوتیں پوری طرح سیاسی میدان میں داخل ہو چکی تھیں لیکن پرتگیزیوں اور ڈچ نے کنارہ کشی اختیار کرلی۔ البتہ انگریز اور فرانسیسی ڈٹے رہے۔ اور یہ سلسلہ میسور کی چوتھی لڑائی تک جاری رہا۔ ٹیپو سلطان کی شہادت کے بعد انگریزوں کا اثر پورے ملک پر قائم ہوگیا۔ اور فرانسیسی بھی میدان سے ہٹ گئے انیسویں صدی میں انگریزوں کے خلاف آخری سیاسی جدوجہد ۱۸۵۷ء میں ملک گیر پیمانہ پر شروع ہوئی لیکن نہ تو یہ باقاعدہ اور منظم تھی اور نہ ہی اس کو طاقتور قیادت حاصل تھی۔ نتیجہ دہلی کے

لال قلعہ پر بھی ایسٹ انڈیا کمپنی کا پرچم لہرانے لگا۔ جس کے بعد سے انگریزوں نے سیاست' معاشرت تعلیم کے ہر میدان میں اپنے نقطہ نظر اور اپنی پالیسی کو مقامی مفادات پر ہمیشہ ترجیح دی۔

یوں تو انیسوں صدی کی ابتداء ہی میں انگریزوں نے تعلیمی اصلاحات شروع کر دی تھیں۔ اعتبار سے انگریزوں کی پہلی عظیم کامیابی ۱۷۵۷ میں پلاسی کی جنگ میں ان کی فتح تھی۔ اس کے ٹھیک ایک سو سال بعد ۱۸۵۷ میں ان کو پورا ہندوستان مل گیا۔ لیکن اس ایک سو سالہ دور میں انگریز مسلسل تعلیم کی ترویج میں دلچسپی لیتے رہے اس کی وجہ یہ تھی کہ تعلیم ہی کے ذریعہ خیالات اور افکار میں انقلاب پیدا کیا جاسکتا ہے اور خاص قسم کا کردار ڈھالا جاسکتا ہے۔ اور افراد کی صلاحیتوں کو اپنے مقاصد اور مفادات کی عمل آوری کے لئے استعمال کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ ان ہی اغراض کے لئے محدود پیمانہ پر ہی سہی لیکن ان کے قائم کردہ تعلیمی ادارے مسلسل کام کرتے رہے۔

چنانچہ ۱۸۱۳ء کے چارٹر ایکٹ کے مطابق ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندوستان میں تعلیم کی ذمہ داری کو ایک حد تک قبول کر لیا۔ اس ایکٹ کے بعد ہندوستانی علوم اور ادب کے احیاء اور ترقی کے لیے برطانوی علاقوں میں خرچ کرنے کے لیے ایک لاکھ کی رقم کمپنی نے منظور کی ۔ ان کے سامنے بعض اہم مسائل تھے۔ پہلا سوال یہ تھا کہ آیا ایک محدود طبقہ کو ابتدائی سے اعلیٰ تعلیم تک کی سہولتیں فراہم کی جائیں یا پھر عوام کو ابتدائی تعلیم دی جائے؟ کیونکہ ظاہر ہے کہ دونوں کی تکمیل ان کے وسائل کے تحت ممکن نہیں تھی۔ دوسرا اہم مسئلہ یہ تھا کہ آیا مشرقی علوم اور ثقافت کو محفوظ رکھا جائے اور اس کو ترقی دی جائے یا مغربی اور جدید علوم کی تعلیم کا انتظام کیا جائے؟ اور تیسرا اہم سوال یہ تھا کہ ذریعہ تعلیم کیا ہو آیا انگریزی کے ذریعہ تعلیم دی جائے یا سنسکرت ' عربی یا فارسی کو ذریعہ تعلیم بنایا جائے؟ یہ تینوں سوالات مشکل اور پیچیدہ تھے اور جہاں تک ہندوستانی معاشرہ کا تعلق تھا اس کی بہت بڑی تعداد یعنی نوے فی صد سے زیادہ تعلیم سے بے بہرہ تھی ۔ نیز ان کا تہذیبی مزاج بھی مغربی طرز فکر اور تعلیم کے لیے بالکل تیار نہ تھا۔

تاہم انگریزوں کے لیے یہ لازم تھا کہ مقامی نظم و نسق کو کامیابی سے چلانے کے لیے مقامی لوگوں کو تعلیم دی جائے۔ اس لیے آہستہ آہستہ انہوں نے اس سلسلہ میں اہم اقدامات کیے۔ جہاں تک ہندوستانی دانشوروں کا تعلق تھا ان میں سے چند عظیم شخصیتوں کو اس بات کا احساس ہو چکا تھا کہ مغربی علم و فکر زمانہ کے نئے تقاضوں کے لیے زیادہ مفید اور کار آمد تھا۔ ان کو اس بات کا بھی احساس ہو چکا تھا کہ اب انگریزی تسلط ناقابل شکست ہے۔ لہٰذا حالات سے نبرد آزما ہونے کے لیے اور ہندوستانی قوم کو مزید تباہی اور افلاس سے بچانے کے لیے انہوں نے

مغربی اور جدید علوم کے حق میں فیصلہ کیا۔ چنانچہ راجہ رام موہن رائے جیسی شخصیت نے انیسویں صدی کے نصف اول ہی میں مغربی تعلیم اور انگریزی ذریعہ تعلیم کی حمایت کی۔ چنانچہ کلکتہ میں سب سے پہلے اور اس کے بعد بمبئی اور مدراس میں ایسے تعلیمی ادارے قائم ہو۔ نے لگے جو مشنریوں کے زیر انتظام نہ ہونے کے باوجود انگریزی تعلیم کے مراکز تھے۔

۱۸۱۳ کے چارٹر ایکٹ کے بعد ہی یہ فیصلہ کیا جاچکا تھا کہ سماج کے ایک محدود طبقہ کو زیور تعلیم سے آراستہ کیا جائے۔ اس نقطہ کا اعادہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے کورٹ آف ڈائرکٹرز نے ۱۸۲۷ میں کیا۔ اسی کا تذکرہ کرتے ہوئے لارڈ میکالے (Lord Macaulay) نے ۱۹۳۵ میں لکھا:

> We must at present do our best to from a class who may be interpreters between us and the millions whom we govern a class of persons Indian in blood and clour, but English in tastes, in opinions, in morals and intellect To that calss we leave it to refine the vernacular dialects of the country to enrich those dialects with terms of science borrowed from the western nomenclature and to render them by degrees fit vehicles for conveying Knowledge to great mass of population

---

Quoted by P L Rawat, History of Indian Education; Agra 1970 p 163

یعنی فی الحال ہم کو ایک ایسے طبقہ کی تیاری کی پوری کوشش کرنی چاہیے جو ہمارے اور ان کئی ملین افراد کے مابین رابطہ کا سبب بن سکے جن پر ہم حکومت کرتے ہیں۔ یہ افراد کی ایسی جماعت ہوگی جو رنگ اور خون کے اعتبار سے ہندوستانی ہوگی لیکن ان کا مذاق' رجحانات' اخلاق اور ذہن انگریزی ہوگا۔ یہ بات اس طبقہ پر منحصر ہے کہ اپنے ملک کی مقامی بولیوں کو ستھرا بنائیں اور سائنس کی اصطلاحات مغربی اصطلاحات سے حاصل کر کے اسے مالا مال کریں پھر بتدریج عوام تک علم کی ترسیل کا اسے ذریعہ بنائیں۔

اسی موضوع پر بحث کرتے ہوئے میتھیو آرتھر (Mathew Arthur) کہتا ہے۔

> Education was to permeate the masses from above Drop by drop frod the Himalayas of Indian life use ful information was to trickle downwords forming in time a broad and stately stream to irrigate the thirst/plains.

نیچے کی طرف جاری ہوگا۔ اور پھر ایک موقعہ پر یہ ایک وسیع دھارا بن جائے گا جس سے پیاسے میدانوں کی آبیاری ممکن ہوگی۔

انگریزوں کی اس محدود طبقاتی تعلیم کے سیاسی مقاصد سے قطع نظر یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ پورا ہندوستانی سماج انیسویں صدی میں عام تعلیم کے لیے تیار نہ تھا۔ اس ملک کی آبادی کی بہت بڑی اکثریت غیر برہمنوں کی تھی اور زمانہ قدیم سے علم کی اجارہ داری بڑی حد تک اسی طبقہ کو حاصل تھی ۔ جہاں تک چھتریوں اور ویشوں کا تعلق تھا ان میں تعلیم تو ممکن تھی لیکن بہت محدود اور پھر پست طبقات مثلاً" اچھوتوں کی تعلیم کا اس زمانہ میں کوئی تصور ہی نہ تھا۔ اسی طرح مسلمانوں میں بھی تعلیم ایک خاص طبقہ تک محدود تھی ۔ ان کی آبادی کا ایک بڑا حصہ جاگیرداروں اور زمینداروں پر مشتمل تھا جن میں انحطاط کے دور میں خاص طور سے تعلیم سے شغف بہت کم رہ گیا تھا۔ دیگر یہ کہ عہد وسطیٰ کی زندگی زیادہ تر سپاہیانہ یا زرعی تھی۔ تجارت اور کاروبار بھی محدود تھے اس لیے عام تعلیم کی افادیت عملی نقطہ نظر سے بہت کم تھی۔ چنانچہ جب انگریزوں نے مغربی تعلیم کے پروگرام بنائے تو ان کو اس ملک میں ایک بہت ہی چھوٹا طبقہ ایسا ملا جس کو علمی دلچسپیوں کی طرف مائل کیا جاسکتا تھا۔ غالباً" یہی وجہ ہے کہ عام تعلیم کی پالیسی کی جانب انہوں نے خاص توجہ نہیں دی ۔ لیکن اس کا ایک اور اہم سیاسی سبب یہ بھی تھا کہ عوام کے تعلیم دینے سے اس بات کا اندیشہ تھا کہ مسائل کا شعور اور سیاسی بیداری ان کو بغاوت پر آمادہ کر سکتی ہے۔ غالباً" یہی اسباب تھے جن کی بناء پر ایک محدود طبقہ کی تیاری پر زور دیا گیا جن کی خدمات حاصل کر کے وہ اپنے نظم و نسق کو چلانے اور افکار کی اشاعت میں مدد لے سکتے تھے۔ انیسویں صدی کے نصف اول میں ۱۸۳۵ اور ۱۸۵۴ کے دوران بنگال ' بمبئی اور مدراس کے صوبوں میں مغربی طرز کی تعلیم کا رواج تیزی سے مدارج طے کرتا گیا ایسٹ انڈیا کمپنی کے چارٹر ایکٹ کا یہ اصول تھا کہ اس کا ہر بیس سال بعد از سر نو جائزہ لیا جائے اور نئی تجاویز پیش کی جائیں اس سلسلہ میں جان اسٹیورٹ (John Stuart Mill) کی تحریروں کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ مل مشہور انگریزی مفکر تھا۔ چنانچہ اس سلسلہ میں ۱۸۵۴ کے (Despatch Woods) کو بنیادی اہمیت حاصل ہے اس Despatch میں مغربی علوم کی افادیت اور اہمیت اور مشرقی علوم کی نئے تقاضوں سے عدم مطابقت کو تسلیم کیا گیا۔ میکالے کہتا ہے:

> We must emphati cally declare that the education which we desire to see extended in India is that which has for its object the diffuslon of the improved arts. Science, philosophy and literature of Europe in short of European Knowledge,

ہندوستان میں رواج دینا چاہتے ہیں اس کا مقصد یورپ کے ترقی یافتہ فنون ' سائنس ' فلسفہ اور ادب کی اشاعت ہے۔ یعنی مختصراً" یورپی علم کی ترویج ہے۔ اس ڈسپیچ نے ہر صوبہ میں محکمہ تعلیم کے قیام کی سفارش کی۔ علاوہ ازیں اس ڈسپیچ نے کلکتہ ' بمبئی اور مدراس میں لندن یونیورسٹی کے طرز کی جامعات کے قیام کی سفارش کی۔ چنانچہ اسی زمانہ میں کلکتہ ' بمبئی اور مد میں یونیورسٹیوں کا قیام عمل میں آیا۔ اس ڈسپیچ کو بجا طور سے ہندوستانی تعلیم کا منشور (Magna Carta) کہا جاتا ہے۔ اس میں ابتدائی تعلیم سے لے کر جامعاتی تعلیم تک کا مکمل نظام پیش کیا گیا ہے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد جب انگریزوں کو پورے ملک پر تسلط حاصل ہوگیا تو ان کا تعلیمی نظام بڑی تیز رفتاری کے ساتھ ہندوستان کے دوسرے علاقوں میں بھی پھیلنے لگا۔ اور بے شمار ہائی اسکول اور کالج ملک کے بڑے بڑے شہروں میں قائم ہوئے۔ مختلف گورنر جنرلوں اور وائسرایوں نے بطور خاص شخصی طور سے بھی ہندوستان میں تعلیم کی اشاعت میں دلچسپی لی۔ انیسویں صدی میں تعلیمی میدان میں جو ترقی ہوئی اس کا جائزہ طوالت کا باعث ہوگا اس لیے اس کتاب کے مختصر اور مخصوص مباحث اور مقصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے بیسویں صدی کی تعلیمی سرگرمیوں پر توجہ مرکوز کرنا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔

بیسویں صدی کی ابتداء ہر میدان میں تیز رفتار تبدیلیوں کے ساتھ ہوئی لیکن اس صدی کے ابھی چودہ سال بھی نہیں گزرے تھے کہ پہلی جنگ عظیم چھڑ گئی۔ اس جنگ میں ہندوستان کو بھی برطانیہ کا ساتھ دینا پڑا۔ یہاں یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ مغربی افکار اور مغربی تعلیم کی روز افزوں ترقی کی وجہ سے انیسویں صدی ہی میں ہندوستانی عوام میں سیاسی شعور پیدا ہوگیا تھا۔ مغربی فکر کے بعض تصورات نے ہندوستانیوں کے ذہن پر گہرا اثر ڈالا۔ مثلاً" جمہوریت ' آزادی ' مساوات ' انسان دوستی ' اقتدار اعلیٰ اور قومیت کے تصورات اس زمانہ میں یورپی اقوام میں دور رس تبدیلیوں اور انقلابات کا باعث بن رہے تھے۔ انگریزی تعلیم کی وجہ سے جب ہندوستانی ان تصورات سے آشنا ہوئے تو اس کا یہ منطقی نتیجہ تھا کہ مغربی طرز کا شعور اور قومی آزادی کی تمنا ہندوستانیوں میں بھی پیدا ہوئی۔ انیسویں صدی کے اہم ہندوستانی مفکرین اور مصلحین میں راجہ رام موہن رائے ' رانا ڈے ' بال گنگا دھر تلک اور سر سید احمد خاں کے نام قابل ذکر ہیں۔ یہ ہندوستان کی صرف چند اہم شخصیتیں نہیں تھیں بلکہ ان کے ساتھ اور بھی بے شمار عظیم رہنما اور تعلیم یافتہ افراد کے گروہ تھے۔ جو ان خیالات اور افکار کی اشاعت کر رہے تھے۔ چنانچہ ان ہی کوششوں کے نتیجہ کے طور پر ۱۸۸۳ء میں آل انڈیا نیشنل کانگرس کی بنیاد پڑی جو ابتداً" سماجی اور معاشی اصلاح کا ایک ادارہ تھا۔ لیکن بعد میں اس کو ہندوستان کی قیادت اور آزادی کے

حصول کی خدمت کا موقع ملا بیسیویں صدی کی ابتداء ہی سے انیسویں صدی کی قائم شدہ بنیادوں پر ہندوستانی قومیت کی نئی عمارت کی تعمیر شروع ہو چکی تھی یہی وجہ ہے کہ جب پہلی جنگ عظیم شروع ہوئی تو ہندوستانی رہنماؤں نے اس میں شرکت سے انکار کر دیا۔ مجبوراً انگریزوں کو بہت سی مراعات کے وعدے کرنے پڑے۔ لیکن جب جنگ کے بعد ان وعدوں کی تکمیل سے گریز کیا جانے لگا تو اس کے رد عمل کے طور پر سیاسی جدوجہد میں تیز رفتاری پیدا ہوگئی اور مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی اور دوسری بڑی شخصیتوں کے ساتھ ساتھ مہاتما گاندھی بھی شریک ہوگئے۔ یہ زمانہ ہندوستان کی تاریخ میں ایک اہم موڑ کی حیثیت رکھتا ہے چنانچہ ان انقلابی رجحانات کو دیکھتے ہوئے انگریزوں کے لیے اس کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا کہ ہندوستانیوں کے بے شمار مسائل کو حل کرنے کی کوشش کی جائے۔ ان مسائل میں تعلیم ایک اہم مسئلہ تھا۔ چنانچہ اس سلسلہ میں مانٹیگ (Montage) اور لارڈ چیمس فورڈ (Lord Chelmsford) نے ۱۹۱۹ء میں ایک اصلاحی رپورٹ پیش کی۔ اس زمانہ میں ہندوستان میں تعلیم کو ایک اہم قومی مسئلہ تسلیم کر لیا گیا تھا۔ ان مختلف رپورٹوں کے نتیجہ کے طور پر بیسویں صدی میں وقتاً فوقتاً تعلیم کے لیے سرکاری مصارف اور تعلیمی اداروں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا۔

جہاں تک سرکاری اور غیر سرکاری مالی امداد کا تعلق ہے اس کا اندازہ ذیل کے جدول سے کیا جاسکتا ہے۔ البتہ یہاں یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ ذیل میں جو اعداد و شمار دئے جا رہے ہیں وہ صرف ہندوستان کے ان علاقوں سے متعلق ہیں جو براہ راست حکومت برطانیہ کے تحت تھے۔ اور اس میں دیسی ریاستیں اور ان کے تعلیمی مسائل شریک نہیں ہیں:۔

مصارف لاکھ روپوں میں

ذریعہ	1901-02	1916-17	1921-22	1931-32	1936-37
سرکاری	103	392	902	1246	1236
غیر سرکاری					
1- ضلع پنچایت	59	174	168	280	257
2- بلدیہ	15	49	79	158	178
3- فیس	127	319	380	623	711
4- دیگر ذرائع	97	195	308	412	424
میزان	401	1129	1837	2719	2806

مندرجہ بالا جدول پر نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ حکومتی مالی امداد میں ۱۹۰۱ کے مقابلہ میں ۱۹۳۷ میں تقریباً بارہ گنے کا اضافہ ہوا۔ اور بحیثیت مجموعی تعلیم پر جو مصارف عائد ہوئے اس میں اسی زمانہ میں سات گنا اضافہ ہوا۔ ان اعداد سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ حکومت برطانیہ تعلیم کی ترقی اور ترویج میں مثبت حصہ لے رہی تھی۔ گو کہ ملک کی آبادی اور تعلیمی پسماندگی کے پیش نظر یہ تمام مصارف اور کوششیں بہت کم اور ناکافی تھیں لیکن جب ان اعداد کا مقابلہ انیسویں صدی کی صورت حال سے کیا جاتا ہے تو بہرحال تعلیمی میدان میں نمایاں ترقی کا رجحان نظر آتا ہے۔ مصارف کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ یہاں تعلیمی اداروں اور طلباء کی بڑھتی ہوئی تعداد کا بھی ایک سرسری جائزہ لیں جس سے عوام میں تعلیم کی مقبولیت اور ترویج کا پتہ چلے گا۔ چنانچہ ۲۲-۱۹۲۱ء سے ۳۷-۱۹۳۶ء تک کی تعلیمی ترقی کا تختہ ذیل میں درج ہے

	اداروں کی تعداد		طلباء کی تعداد	
ادارہ کی قسم	1912-22	1936-37	1921-22	1936-37
1- یونیورسٹیاں	10	15	اعداد نامعلوم	9697
2- آرٹ کالج	165	217	45418	86273
3- پیشہ ورانہ کالج	64	75	13662	20645
4- ثانوی مدارس	7530	13065	1106803	2287872
5- پرائمری مدارس	155017	192344	6109752	10224288
6- اسپشل مدارس	3344	5647	120925	259269
میزان مسلمہ ادارے		1.66,130	2,11,308	73,96,560 1,28,88,044
7- غیر مسلم ادارے	16,322	16,647	4,22,165	5,01,530
جملہ میزان	1,82,452	2,27,955	78,18,725	1,33,89,574

انیسویں اور بیسویں صدی میں برطانوی اقتدار کے تحت تعلیم کی جو سرپرستی ہوتی رہی اس سے یہ سمجھنا چاہیے کہ ان حکومتی اداروں کے علاوہ کوئی اور اہم تعلیمی مراکز نہیں تھے۔ حقیقت دراصل اس کے برعکس ہے۔ اس ضمن میں ایک اور بات کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے۔ وہ یہ کہ عام طور سے یہ کہا جاتا ہے کہ مغربی افکار اور تصورات نے ہندوستانیوں میں سیاسی شعور اور آزادی کی تمنا کو بیدار کیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مغربی تعلیم کا بھی اس میں بہت اہم

حصہ ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ ہندوستان کے غیر سرکاری اور خانگی تعلیمی اداروں کا بھی رول انتہائی اہم رہا ہے۔ شاہ عبدالقادر محدث دہلوی کے پیروؤں کا گروہ سلطنت مغلیہ کے کھوئے ہوئے وقار اور آزادی کی حمیت کو بیدار کرنے میں ہمیشہ مصروف رہا۔ سید احمد شہید، مولانا اسمٰعیل، فضل حق خیر آبادی کے کارنامے ہندوستان کی تاریخ میں کبھی بھلائے نہیں جاسکتے۔ ان عظیم شخصیتوں کا تعلق نہ صرف یہ کہ عظیم مشرقی علوم کی درس گاہوں سے تھا بلکہ ان میں ہر فرد بذات خود ایک ادارہ تھا۔ روشنی کا ایک مینار تھا جس نے ہندوستان کے طول و عرض میں سماجی مسائل سے آگاہی، حال سے بیزاری اور مستقبل کی فکر پیدا کی۔ دارالعلوم دیو بند، ندوۃ العلماء سہارن پور، بریلی، جامعہ نظامیہ حیدر آباد چند اہم بڑے تعلیمی مراکز ہیں جہاں علوم مشرقیہ کی تعلیم دی جاتی ہے۔ اسی قسم کے تعلیمی ادارے ہندو ماہرین تعلیم نے بھی بنارس، ہردوار، پونہ، بمبئی، جے پور، آگرہ، الہ آباد، تروپتی وغیرہ میں قائم کر رکھے تھے جہاں اپنے افکار اور خیالات کی اشاعت کرتے تھے۔ ان غیر سرکاری اداروں کے ساتھ ہزاروں چھوٹے تعلیمی ادارے ملحق یا وابستہ تھے جن کی شاخیں ہر شہر اور قصبہ بلکہ بے شمار گاؤں میں بھی پھیلی ہوئی تھیں۔ خانقاہوں، دھرم شالوں اور مٹھوں کی درس گاہیں اس کے علاوہ تھیں۔ تعلیم کے یہ بے شمار مراکز سینکڑوں برس سے کام کرتے چلے آرہے تھے۔ ان میں جو بہت پرانے تھے ان کے مصارف عموماً اوقافی جائدادوں سے پورے کیے جاتے تھے۔ لیکن جو تعلیمی ادارے سلطنت مغلیہ کے زوال کے بعد شروع ہوئے ان کی پشت پر کوئی اوقافی جائدادیں نہیں تھیں اس لیے ان کی مالی حالت بہت کمزور تھی ان کے مالیہ کا انحصار بڑی حد تک عوام کی امداد اور چندوں پر تھا۔ لیکن یہ ایک حیرت انگیز بات ہے کہ انیسویں اور بیسویں صدی میں ہندوستانی عوام نے اپنی بڑھتی ہوئی غربت کے باوجود ان اداروں کی مدد اور معاونت میں کوتاہی نہیں کی۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ اس زمانہ میں ان غیر اوقافی اداروں نے تعلیم اور سماجی سیاسی بیداری میں غیر معمولی کارنامہ انجام دیا۔ انگریزی سامراج کے تحت بھی مشرقی علوم کا چرچا ہندوستان کی سرزمین پر کم نہیں تھا۔ اور بحیثیت مجموعی تعلیم کی اشاعت میں یہ ادارے سرکاری اداروں سے پیچھے نہیں رہے۔ گوکہ ان اداروں سے فارغ التحصیل طلباء کا معاشی مستقبل بڑی حد تک غیر یقینی بلکہ تاریک تھا۔ لیکن مذہبی اقدار اور اخلاق کی بحالی اور برقراری میں ان اداروں نے اہم رول ادا کیا۔ آج ہندوستان میں مذہب، اخلاق اور جدیدیت کا جو امتزاج پایا جاتا ہے وہ ان خانگی اور سرکاری دونوں قسم کے اداروں کی مسلسل اور ڈیڑھ سو سالہ جدوجہد کا نتیجہ ہے۔ آج جو سماج نظر آرہا ہے وہ اس تعلیمی ترسیل کا عکس ہے جو انیسویں اور بیسویں صدی میں عمل پیرا تھا۔